

لوگوں کی طرح ہوں۔ میرا بھی چاہتا ہے تمام پتیل کے برتن مانجھے جائیں، دریاں کھیس جھاڑ کر بچھائے جائیں، ہمارا پان ہوں، ڈھول تاشے بھیں۔ کمیں سے ایک سرخ قالین کا گلزار بھی آئے جو مہمان کے لئے بچھایا جائے۔ کوئی مینڈھاڑنے ہو۔ کوئی دیگر چڑھے۔ یہ ساری شواف قسم کی میزبانی شاید میں نے سکول سے یعنی تمی جہاں اسپکٹر آف سکولز کی آمد پر چھڑ کا وہ ہوتے، کیلئے کے پتوں کے پھانک بنتے، سفیدیاں ہوتیں، بچے اسپکٹر آف سکولز کے راستے میں پھول کی پتیاں بچھاتے اور زور زور سے بینڈ جاتا۔ ”نوری از اے جوی گڈ فیلو... فور ہی از اے جوی گڈ فیلو...“

میرے چرے پر مہمان کی خبر لکھتے ہی جو خوشی پھیلی ہو گی اسے دیکھ کر خان سپٹا گئے۔ ”دیکھو قدیسہ کچھ بڑھاچڑھا کے نہ کرنا..... شاب ایسی باتوں سے گھبرا جانا ہے، ہم باورچی خانے میں گھانا کھائیں گے۔ تم پوریاں کچھ اچھی ہنلتی ہو بس وہی ٹھیک ہیں۔ آلوکی پوریاں پتھے وغیرہ..... زیادہ کچھ نہ کرنا.....“

اس گھر کے شروع میں برآمدہ اور آخر میں باورچی خانہ تھا۔ اور اصل میں بھی دو جگہیں زیادہ آبادر ہتی تھیں۔

”لیکن باورچی خانے میں کیوں خان صاحب.....؟ ہمارے پاس تو نوٹل چار ڈنگی موز میں ہیں۔ ایک چھوٹی پتاپی ہے تین کاچولہماہے..... یہاں وہ کیسے کھانا کھائیں گے؟“

”جیسے کھاتے ہیں ویسے کھائیں گے.....“

خان صاحب میں ایک بڑی زیادتی ہے۔ وہ کسی کی خاطر نہ اپنی زندگی کا پیڑن نہ اپنے معقولات کا نہیں۔ اپنے مراج کا زادویہ بدلتے ہیں۔ وہ جس طرح بیٹھے ہوں گے ویسے ہی مہمان سے مٹے ٹپے جائیں گے بلکہ اسے اپنے پاس بلا لیں گے۔ جو کھار ہے ہوں گے اسی چنپی روٹی میں مہمان کو شامل کر لیں گے۔ جیسا مودہ ہو گا اس کے مطابق عمل کریں گے۔ ان کے پاس کھانے اور دکھانے کے لئے ایک ہی سیٹ و انتون کا ہے۔ دفتر، نسل خانے، بازار، ریڈی یو شیشن، میلی ویرین، سوڈو یو میں اشراق احمد گرگٹ کی طرح رنگ نیں بدلتے بلکہ ہر مقام اور جگہ پر ان کا صرف رول بدلتا ہے وہ خود وہی رہتے ہیں اگر وہ کسی ادبی محل میں پاکستان یا اسلام کی خیر خواہی میں کسی سے الجھ جائیں تو میں لاکھھا تھہ باندھوں وہ اپنا نظریہ بیان کر کے رہیں گے۔ اگر وہ کتابوں والی الماری کی جانب چہرہ کر کے کتاب پڑھنے میں مصروف ہیں اور کوئی مہمان آ جاتا ہے تو وہ بھاگ بھاگ نہ اپنی نیکر جیکٹ بد لیں گے نہ ہی اپنا انداز نہست۔ بس اسی انداز میں بیٹھے کبھی گلگلکو کے ساتھ، کبھی مکمل خاموشی سمیت مہمان کے پلا گن رہیں گے..... وہ اصل اس انداز سے خان صاحب کی مرادیں ہوتی ہے کہ مہمان مکمل طور پر اپنے آپ کو گھر کافر دکھھے۔ بیٹھنا چاہے تو بیٹھے، باورچی خانے میں کچھ کھانا پینا چاہے تو زہے نصیب..... وہی از یا میلی ویرین لگا کر چھوٹے خاتون سے۔

گپ چپ کی خواہش بتو اور بھی اچھا۔ کوئی بھی پرچزہ کر کر بتو دیں کو دانہ دنکاڑاں گر راضی ہوتا ہو تو کسی قسم کی ممانعت نہیں۔ باہرزاویے میں بینہ کر کسی سے لبے لبے فون کر کے خوش رہے تو کسی کو اعتراض نہ ہو گا۔ ایسی فضایں آزاد منش لوگ ان سے بہت زیادہ ہل جاتے ہیں لیکن فارمل لوگ جنیں ذرا سچ روم، نمائش کی گفتگو، بھی صحائی ٹرولیاں، مشوپپر، کوارٹ پلیشن، گھنٹے سے گھنٹا جوڑ کر بینہ کی عادت ہو ان سے زیادہ دیر راضی نہیں رہتے۔

شاب بھائی کو غالباً خان صاحب کی بیوی ادا پسند تھی۔ خود آزاد رہتا اور دوسرے کو آزاد رکھتا۔ اسی لئے وہ خان صاحب سے زیادہ خوش نظر آتے تھے۔

ممن آباد کے چھوٹے سے آٹھ بائی چھ کے باور پھی خانے میں اس شام ایک بڑی یاد گار دعوت ہوئی۔ چھوٹی سی بیچی تپائی نہ میز پر ویشنو کھانا چنا گیا۔ جس وقت شاب بھائی اور عفت آئے وہ بیچے گول موڑھوں پر بڑی بے تکلفی سے بینہ گئے حالانکہ اس وقت عفت نے سفید سائز ہی اور ہندو لے کی شکل کے آدیزے پہن رکھے تھے اور شاب بھائی پر تکلف نیلے سوت میں ملبوس تھے۔ وہ یا تو کسی فارمل پارٹی سے آرہے تھے یا ان کو اس دعوت کے بعد گورنر ہاؤس وغیرہ جانا تھا۔ شاب بھائی نے بغیر تعریف کے کھانا اس رغبت اور محبت سے کھایا کہ ہمیں احساس بھی نہ رہا کہ اس سے زیادہ کچھ کرنا ممکن بھی تھا۔ اسی یاد گار دعوت شیراز کے دوران شاب بھائی نے ان ادیبوں کی فرست تیار کی جن کو گلڈ کی طرف سے مشرقی پاکستان جانا تھا۔ جتنی دیر یہ لست تیار ہوتی رہی اعجاز بنا لوی اور جیلہ ہاشمی کاتام بار بار آیا۔ میں اس وقت صاحب کتاب تھی لیکن ان دونوں کے چروں پر بیری ادھی کی کوئی پچان نہ تھی..... بار بار میرا بھی چاہا کہ کہوں شاب بھائی آپ مجھے مشرقی پاکستان بے شک نہ بھجیں لیکن پلیز اتنا تو اماں کہ میں ادیبوں کی فرست میں شامل ہونے کے قابل ہوں۔

ایسی ہی خفت میں نے ایک دفعہ پلے بھی برداشت کی تھی۔ میرا بھلا بیٹا انہیں خان یمار تھا اور میں اسے گودی میں اٹھا کر ممن آباد کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔ انہیں بھی تھوڑا تھوڑا صاف بولنے لگا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی فیس کتنی ہو گی۔ میرے پاس جو چند روپے کے نوٹ تھے انہیں میں نے بل دے کر مٹھی میں قابو کر کھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بڑی بند بند شخصیت کے آدمی تھے۔ ان کے کلینک میں کوئی مریض نہ تھا۔ پھر بھی وہ فارم کو الفائیڈ ڈاکٹروں کی طرح ڈھنی طور پر Pre-occupied نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں کری میں آگے ہو کر بینہ تھی۔ انہیں خان کی بند بنا کے سیطی کی آواز برابر آتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نہ مریض کی حالت پرچھنے کے مذہبی تھنہ نہیں بولتے تھے۔ میں نے انہیں ملام کرنے کے انداز میں کہا۔

”جی میں اشراق احمد کی بیوی ہوں.....“

ان کے چہرے پر اس نام سے کوئی چکنہ آئی۔ بلکہ ایک ابر و قدرے اور اوپر اٹھ گیا۔
 ”متاز مفتی اور شہاب صاحب کا نام تو آپ نے سنائے گا..... قدرت اللہ شہاب! وہ میرے شوہر
 کے بڑے دوست ہیں۔“ -
 ڈاکٹر صاحب نے مریانہ انداز میں سکراتے کی ہلکی سی کوشش کی لیکن ان دونوں ناموں کا ان پر
 کوئی اثر نہ ہوا۔ ”میں بھی لکھتی ہوں..... ریڈیو ڈرامے کہانیاں ناول“ -
 ان کے چہرے پر ”اوں ہوں“ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ مجھے درمیان میں جملہ ادھورا چھوڑنا
 پڑا۔

”منہ کھولو اور اور“ میری باتوں کی پروانہ کرتے ہوئے انہوں نے انیس خان سے
 کہا۔ ماں کی باتوں کے جھوٹ کی تصدیق وہ بیٹھے کارہن کھلوا کر کر ناچا ہے تھے۔
 انیس نے منہ کھولا
 ”اور“
 چھوٹا سادہ بن اور کھلا
 ”اور“
 انیس کارگنک بدلا اور منہ اتنا ہی کھلا رہا۔
 ”کیا نام ہے تمہارا!“ -
 انیس نے تو تلی زبان میں مختار مختار کر ایک لمبی سی غلظت گالی دی۔
 ڈاکٹر صاحب جو Snob تھے پورے جنمبوڑے گئے۔
 ”کیا؟“

”لالہ“ اور اس کے آگے پھر چند تو تلی ماں بسن کی شان میں مغلقات۔
 ”بیٹھے میں آپ کا نام پوچھ رہا ہوں“ -

انیس نے یہ گالیاں اپنے ناموں پر ویریزتا یا فخار اور ملازم زمان سے سیکھی تھیں۔ اس نے نیا نیا بولنا
 سیکھا تھا اور سکھانے والے سمجھتے تھے کہ بچے کی زبان سے اول اول یہی کچھ لفڑا چھالتا ہے۔ اس کے ساتھ
 اگر مل کر کرہ، موت نے کاہراً تھوڑا سا پان بھی پچھ کھالے تو سبحان اللہ۔ میں نے نہاتھ میں روں کئے ہوئے
 روپے میز پر رکھے، دنگ ڈاکٹر صاحب نہ کھٹا بھول گئے۔ شاید انیس یقین آگیا تھا کہ میں ادیب ہوں
 اور اس انوکھی نوع کے لوگوں کے ہاں ایسے ہی بچے پیدا ہوتے ہیں۔ بالکل اسی خفت میں نے جب محوس
 کی جب گلڈ کی جانب سے ادیبوں کا وفد مشرقی پاکستان چلا گیا اور میری ادیسی نے کوئی گل نہ کھلائے۔ کتنی
 دن میں اندر ہی اندر اس بے انصافی پر کڑھتی رہی۔ سندربن کے ہاتھی، جو بہڑوں میں اسے شپلہ کے

پھول، بازاروں میں بکتے ناریل، بلی زلفوں سیاہ آنکھوں والی بیگنائیں..... یہ بند خواب میں کھلی آنکھوں اتنی مرتبہ دیکھنے لگی کہ مجھے یاد ہی نہ رہا۔ شفاق احمد کوڑھا کہ گئے کافی دن ہو گئے ہیں۔

پھر شباب بھائی مجھے ملنے آئے۔ وہ پر بنگ مشین سے آگے نہ بڑھے۔ مہارانی سیتا کی بس یہی حد تھی۔

”آپ کے خان صاحب کا توڑھا کہ میں بہت دل لگ گیا ہے وہ تو شاید کرشن چوڑا کے درختوں کو چھوڑ کر نہ آسکیں۔“

میرا دل دہک سے رہ گیا۔ میری مزاح کی حس ویے بھی کمزور ہے۔

”کرشن چوڑا کیا شباب بھائی.....؟“

”بہت بڑا چھتنا، اور خست ہوتا ہے۔ اس پر کیسری، نارنجی پھول لکھتے ہیں پکھوں کی ٹھکل میں..... اشفاق کو ان درختوں سے محبت ہو گئی ہے۔“

جو انی میں شہر کو اگرا پنی ذات سے پرے اخبار بھی اچھا لگے تو اخبار بھی بر الگتا ہے۔

”اعجاز شالوی اور اشفاق صبح صح ناشتے کے وقت پورا پورا التکر کیلوں کا کھا جاتے ہیں۔ وہاں کا کیلا اتنا بڑا اور بے حد میٹھا ہوتا ہے.....“ شباب بھائی نے کہنی تک اشارہ کیا۔ ایسے کیلے تو میں نے دیکھے نہ سنے۔ پھر پورا التکر کیلوں کا خریدنا بھی مڈل کلاس کی عورت کے لئے اچھے کی بات تھی۔

”دوپر کے کھانے کے ساتھ ڈاپ پیتے ہیں۔ دودوڈا بی کس!“

”ڈاپ کیا شباب بھائی؟“

”کچا ناریل..... بالکل کچا اس کے اندر ابھی اس کی گری دودھیا ہوتی ہے اسے درمیان میں سے کاشتے ہیں پھر در انتی نما چھری سے ذرا سا کریدیتے ہیں۔ ناریل سارے کامار الطیف پانی میں بدل جاتا ہے۔ میٹھا دودھیار س۔“

”اچھا ہی؟ بد امزیدار ہوتا ہو گناہ ناریل کا دودھ۔“

”بہت..... آپ تو وہاں گئی نہیں ورنہ آپ بہت انجوانے کرتیں۔“

میں نے نگاہیں جھکالیں..... اب میں ان سے کیا کہتی کہ میں ڈھا کہ کیوں نہ گئی؟۔ ”شام کے وقت کھل کا پھل اور میٹھا ہی..... بلکہ براون دہی..... عجیب محسوس ہوتی ہے۔ اس میں۔“

نہ میں نے کبھی کھل کا پھل کھایا تھا نہ براؤن میٹھے دہی سے میری واقفیت تھی۔

”منیز چوہری رات کو سب مندوہ میں گھیر گھار کر کا لے داس کی دکان پر لے جاتا ہے، ورنے بھر بھر کر سوندھیں کھاتے ہیں سب ہرات؟“

”سوندھیں..... وہ کیا ہوتی ہے؟“

”یہ نیز کی مخلائی ہے بڑی لذتیں..... بس اب آپ اپنے دل کو مضبوط کریں۔ اشفاق تو غالباً ملکا کروں کاروں کی ایجنسی لے لے گا.... شام کو کبھی جھرنا کاناچ دیکھتا ہے کبھی کابل کا..... کبھی لیٹی ارجمند بانو کے گیت سختا ہے کبھی فردوسی بیگم کی فارسی غزلیں..... لگتا ہے اب وہ چاث گام میں رہے گا کسی سانوں بگالن کے ساتھ ”۔ یکدم میراچہرہ دیکھ کر شاب بھائی بالکل چپ ہو گئے۔

عام طور پر انسان ان چیزوں کے ذریعے بست گھبرا تاہے جن کے متعلق اس کی معلومات کم ہوتی ہیں۔ ایسی اشیاء جو آپ نے استعمال نہ کی ہوں۔ کسی ایسے علاقے کا ذکر جمال آپ کو جانے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔ نئے رسم و رواج آج کا عہد دراصل انفرمیشن کا عمدہ ہے جس کے پاس جتنی زیادہ انفرمیشن ہوا وہ اسے بگھارنے کافی جانتا ہو اتنا ہی وہ معتبر اور رونی لگتا ہے۔ میں تب کے مشرقی پاکستان کی اجنبی انفرمیشن سن کر یکدم سپٹا گئی اور شاب بھائی کو معاہدہ ہوا کہ وہ مذاق کو بست دور لے گئے ہیں اسی وقت غالباً انہوں نے دل میں میری تلافی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو گا لیکن مجھ پر اپنے خیالات واضح کئے بغیر انہوں نے اجازت لی اور عرفت کو ساتھ لانے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

۴۸ء میں انہوں نے عجیب طور پر اس واقعہ کی تلافی کی۔

ان دنوں ہم سن آباد چھوڑ کر ماذل ٹاؤن آبے تھے۔ گھر کے ارد گرد جیک دی میں شاک کی کمائی جیسے درخت لگے تھے۔ شام کے وقت ماذل ٹاؤن کی سڑکیں بالکل ویران ہو جاتی تھیں۔ ان ویران سڑکوں پر ریاض محمود اپنے سکوٹر پر اور افضل چٹا اور عارف ایک دوسرے سکوٹر پر ہم سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ان دنوں ایکثر برادری اپنی ناداری، غفلت، کسپری کی جھبڑی پوچھنے اتار کر یور و کریٹ برادری کی طرح پاپ منہ میں لے کر پوچھ پوچھ چلانا چاہتی تھی۔ شورز کے لوگوں کو غم تھا کہ بیس سال سے وہ معاشرے کو اندر میں کر رہے ہیں لیکن اس کی خوشحالی، طاقت اور عزت کے کھاتے میں سے کچھ بھی ان کے نام نہیں نکلتا۔ ان دنوں افضل چٹا ابھی قدر آور ایکثر نہیں بنا تھا اس لئے اس کے پاس وار ڈاؤن، سکیوں، تقریروں، خوابوں کے لئے بڑا وقت تھا۔ وہ ہمیں بھی خوب خوب Involved رکھتا۔ الحمرا کے چھوٹے اندر وہی ہاں میں ایکثر اور ایکثر سوں کے جلسے ہوتے۔ بڑی گماہی ہوش و خروش رہتا۔ ان سارے جلوں کا آنکھوں دیکھا حال افضل چٹا شام کو ہمیں سناتا۔ دراصل یہ ان ہی دنوں کی آرزوں کا نتیجہ ہے کہ آج ایکثر برادری معاشرے کی موجودہ کا باں بنی ہوئی ہے اور ان کی تصویریں چھاپ چھاپ کر رہے اخباروں کا پیٹ نہیں بھرتا۔

ایک شام افضل دوڑا دوڑا آیا اس کا بغسل پچھے عارف جاوید گم سکراہٹوں کے ساتھ کبھی افضل کے دمین کبھی بائیں ہو کر شوہریت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پچھر افضل ہر دو لمحے میں اس کی طبیعت صاف کر دیتا۔ ”آپاں! کل قدرت اللہ شاب فیصلہ کرنے آرہے ہیں..... تمام ایکٹروں کی منٹلی ان سے ملے

گی۔ تمام مسائل پیش کئے جائیں۔ پھر ایک سمجھی تفکیل دی جائے گی۔ ” آپ نے ان کا مضمون ”civil lines Culture“ پڑھا ہے آپا ہی ”۔ عارف نے پڑھا۔

”اوے یہ مضمون بچ میں کیسے آگیا؟ کچھ سوچ کر بولا کر؟“ اس کے بعد افضل نے انتنی کو وہ تقریر پورے اشعاروں کے ساتھ پڑھنی شروع کر دی، جو کھیل جولیس سینز کی جان ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی افضل کو خیال نہ آیا کہ قدرت اللہ شاہ کے ساتھ انتنی کی تقریر بچ میں نہیں آسکتی لیکن تب افضل کی عادت تھی کہ بات کرتے کرتے یکدم وہ کسی ڈرامے کا حصہ ایکٹ کرنے لگتا۔ کسی کردار میں اپنی صفت کاری سے جان ڈالنے لگتا۔ کچھ دیر کے بعد جب گھنٹے ٹیک، بازو پھیلا، سر آسمان کی طرف اٹھا اٹھا کر وہ فرینڈز، رومنز اینڈ کنزی میں کی تقریر کر چکا تو پھر قدرت اللہ شاہ کی طرف رجوع کر گیا۔

”آپا قدرت اللہ شاہ کچھ گروہیں۔ اگر کسی کی رسائی ان تک ہو تو آرشٹوں کے لئے وظیفہ، تو کریاں، بیرونی ممالک کے سفر، بت کچھ ہو سکتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اتنے بڑے آدمی کو ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔“

اس وقت تک مجھے بھی یقین نہ تھا کہ میں ان کو جانتی ہوں اس لئے میں بھی چپ رہی۔

دوسری صبح کچھ ایکٹر شاہ بھائی سے ملے اپنی تمام تصوراتی اور حقیقی تکلیفیں انہیں سنائیں۔ شاہ بھائی پوری توجہ سے سنت رہے اور کچھ نہ کچھ کرنے کا وعدہ کر کے اسلام آباد چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد مجھے خط ملا، جس میں ایک سرکاری مینگ کا دعوت نامہ تھا۔ خان صاحب اور میں جب اسلام آباد شاہ بھائی کے گھر پہنچے تو اس وقت مسعود کھدرا پوش اور اشفاق علی خان ان کے ”ایل شیپ“ برآمدے میں بیٹھے ہوئے ناشتہ کر رہے تھے۔ شاہ بھائی نے مجھے صرف اس قدر بrif کیا کہ ایکٹروں کے مسائل اور کچھ کی موجودہ صورت کا جائزہ لینے کے لئے کل ایک سمجھی تفکیل دی جائے گی پیش صاحب اس کے صدر ہوں گے، آپ بھی اس مینگ میں مدعو ہیں۔“

تلائی کا سلسہ شروع ہو گیا تھا۔

دوسری صبح جب شاہ بھائی دفتر جانے لگے تو انہوں نے اپنے پیارے کے ڈرائیور سے بڑی آہستہ آواز میں کہا۔ ” دس بجے تم بی بی کو لے کر ایجو کیشن والے بلاک میں آ جانا اور گاڑی پر جھنڈا لگائے رکھنا.....“۔

تلائی کے ساتھ اعزاز بھی شان تھا۔

مجھے معلوم ہے کہ شاہ بھائی اپنی سیاہ مردیز کے سامنے صرف اس وقت جمذہ الارانے دیتے تھے جب وہ اس میں سوار ہوتے تھی کہ کئی بار ثابت بھی ضد کرتا کہ میں جمنڈ اکھوں کر چاؤں گھاؤوہ جھڑکے بغیر بات روک دیتے۔ اس روزان کی مریانی واضح تھی۔ وہ ایک پرانا قرضہ بیع سود چکانا چاہتے تھے۔ جس وقت مینگ روم میں پہنچی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ کمرے میں بڑی معتبر شکل و صورت کے لوگ موجود تھے..... میرے لئے کرسی پیچھے کھینچ کر تنویر احمد خان نے کان میں کما..... ”شاہ صاحب کا حکم ہے کہ آپ کوئی خودک آفراروں“ - میں ششدرو حیران تھی۔

پواز آلو جھیلی جھیلی یکدم میں ٹھنڈے کمرے میں لیدر کی کرسی سے پشت لگائے تھیں تھی اور جو بھ کے فیض صاحب مجھ سے تین کریاں چھوڑ بائیں آکھے بند کر کے سگریٹ کا دھوؤں چھوڑ رہے تھے۔ کوئی آدھا گھنٹہ باشیں ہوتی رہیں۔ لیکن کرسی صدارت خالی رہی پھر نظریں جھکائے عاجزی کے ساتھ شاہ بھائی کرسی صدارت پر آ کر بیٹھ گئے۔ ”مشر صاحب کسی ضروری کام کے سلسلے میں چلے گئے ہیں۔ اس لئے اس نشست کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ آپ لوگوں سے استدعا ہے کہ آرٹ اور پلٹھر کے چمن میں اور آرٹسٹوں کی موجودہ حالت سنوارنے کے لئے جو بھی مشورے آپ کے پاس ہوں بلا تکلف دیں“ -

میر گیند کو ٹھوکر لگا کر انہوں نے کھلا چھوڑ دیا۔ اب گیند سارے میں لڑکتا پھر تاھا۔ کبھی جیل الدین عالیٰ کے پاس، کبھی فیض صاحب کے آگے..... کبھی قرا الحسن کی سمت میں..... پسلے جملے کے بعد شاہ بھائی نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ اپنی بھانجی گذی سے کما کرتے تھے..... اگر چہ رہنے سے گزارہ چل سکے تو خاموشی پرلا Option ہونا چاہئے۔

تمہارے پاس ہمیشہ دو چواں ہوتے ہیں۔ بولنا اور چپ رہنا..... دوسری چواں پہلی سے بہتر ہے۔

اس مینگ کے دوران کئی مسائل زیر بحث آئے۔ پھر

Standing Committee Art & Culture

تکمیل پائی۔ فیض صاحب اس کے صدر تھے۔ صلاح الدین، قرا الحسن اور ایک خالون مزر کپر جو اس وقت تھے تو مینگ میں موجود تھیں نہ بعد میں کبھی نظر آئیں، مشرقی پاکستان کے نمائندے منتخب ہوئے۔ جیل الدین عالیٰ صاحب مغربی پاکستان کی جانب سے سلیکٹ ہوئے۔ اس کے بعد میں نے ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ اپنے بھانویں کمیٹی مکمل ہو چکی تھی لیکن شاہ بھائی اپنی مدھم آواز میں یوں لے۔ ”میں بانوں قدر سے کاتاں پروپوز کرتا ہوں.....“ -

پڑھنے کی کوشش سے توبیر احمد خان کی آواز آئی آئی سینئر دی موشن ” -

مجھے پڑھی بھی نہ چلا کہ میں کس طرح مینگ میں منتخب ہوئی۔ شاب صاحب اٹھ کر باہر چلے گئے۔ میں نے ذرتے ذرتے فیض صاحب سے پوچھا ”لیکن میں سمجھی نہیں ہم لوگ کریں گے کیا؟ ” بھی تم جاہل لگتی ہو کرنا کیا ہے؟ ہم لوگ پشاور، لاہور، کراچی، ڈھاکہ، حیدر آباد وغیرہ کا دورہ کریں گے۔ وہاں کے ایکٹروں سے میں گے کو نسلیں دیکھیں گے۔ بعد میں رپورٹ کر دیں گے حکومت کو ” -

فیض صاحب کے جواب نے مجھے اور بھی گزبراد یا جب میں کار میں شاب صاحب کے ساتھ واپس آ رہی تھی تو میں نے ان سے پوچھا ”شاب بھائی لیکن سینئر دی میٹی آخز کیا کرے گی؟ اس کے Objectives کیا ہیں؟” -

وہ مدھم سامسکرانے اور آشیرباد کے انداز میں ذرا سا ہاتھ اٹھا کر بولے ”آپ کو ڈھاکہ دیکھنے کا شوق ہے تاں بس وہ دیکھ آئیے فی الحال آپ کا یہی objective ہے باقی تمام کام فیض صاحب کر لیں گے۔” -

شاب بھائی اور خان صاحب میں ایک قدر مشترک تھی۔ وہ دونوں اپنے نرگنگ کے گونگے آدمی رہے ہیں اور شاید اسی لئے انہیں ایک دوسرے کی صحبت میں راحت ملتی تھی۔ شاب بھائی کا گو نگاپن تکلیف دہ نہیں تھا۔ یوں نہیں لگتا تھا جیسے وہ آپ کو مکتر سمجھ کر آپ سے کچھ چھپا رہے ہیں یا وہ اپنی ذاتی زندگی کو صیغہ راز میں رکھنا چاہتے ہیں بلکہ وہ ایک سوئے ہوئے معصوم بچے کی طرح بڑی بے ضرر خاموشی سے وقت بر کرتے تھے۔ اپنے ہر فین کا جواب پہلی مرتبہ ضرور دیتے۔ عورتوں سے ان کے بچوں کا حال پوچھتے۔ مردوں سے ان کی روزی، ترقی گریڈ، بالا افسر، زیر و سوت ملازم کے حالات دریافت کرتے۔ نصیحت آمیر گفتگو سے کبھی بات چیت کو بوجھل نہ کرتے۔ جب نوجوان ان سے بولتے تو یہی دلچسپی سے ان کی باتیں سنتے رہتے ہر مکالے میں خاموشی، رواداری اور کم سے کم گفتگو سے شمولیت کرتے۔

خان صاحب کی خاموشی اضداد سے جنم لیتی ہے۔ وہ طبعاً خاموش ہیں، لیکن مروت کے طور پر، دوسرے کا دل لگانے کی خاطر اپنا آپ چھپانے کے ضمن میں بولتے ہیں ان کی گفتگو ایک پرده ہے، جب اسی گفتگو کے سارے دوسروں کو اپنے بہت قریب آنے سے روک سکتے ہیں۔ میں چونکہ خلوت کی قدر کرتی ہوں اس لئے نہ میں نے خان صاحب کے پردوں سے اندر جھانا کا نہ ہی شاب صاحب کی خاموش چلن کو سر کانا چاہا۔ ممکن ہے کہ شاب صاحب اور خان صاحب دونوں ایک دوسرے کے سرستہ رازوں سے واقف ہوں لیکن اس کی سوہ کسی تیرے کو نہیں لگ سکتی۔ چونکہ میں شاب بھائی کو قیافوں سے جانتی ہوں اور اشfaq خان نے اپنے وجود کے گرد گفتگو کی باز ٹھلاگر کی ہے،

اس نے آج تک مجھے علم نہ ہو سا کہ شاب بھائی کو خان کس حد تک کیسے اور کیوں کر جانتے تھے؟۔
شاب بھائی کا معمول تھا کہ جب وہ لاہور آتے تو ہمیشہ داستان سرائے میں ٹھرتے۔ اگر وہ کار
سے آتے تو کبھی گھنٹی نہ بجاتے۔ اگر ہوائی جہاز یا ٹرین سے ان کی آمد ہوتی تو بھی وہ کبھی گھنٹی پر ہاتھ نہ
رکھتے۔ اشیر خان ہی علبت میں گھنٹیاں بجاتے اور اگر ڈرائیور ساتھ ہوتا تو وہ یہ تمیزیاں دکھاتا۔ شاب
بھائی پورے پندرہ برس داستان سرائے آئے۔ میں نے کبھی انہیں گھنٹی بجا کر اندر آتے نہیں دیکھا۔

اگر وہ کسی پھوٹے سے ذاتی کام یا سیر کے لئے بھی باہر جاتے تو واپسی پر ہمیشہ لمبا اور
لگنی کا بعلی دروازہ اختیار کرتے۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پچھلے برآمدے کے دروازے
تک پہنچ جاتے۔ اگر دروازہ کھلا پاتے تو اندر آجاتے درہ اندر والی لان میں ٹھلنے لگتے۔ پھر جب
کوئی برآمدے میں اچانک آتا تو ان کے لئے دروازہ کھول دیتا۔ دروازہ کھلنے پر انہوں نے
کبھی شکایت نہ کی کہ بھٹی میں تو پون گھنٹے سے کھڑا ہوں تھم لوگ کہاں تھے یا یوں کہ گئی
بڑی تھی بڑی تکلیف ہوئی ॥

شاب بھائی کسی پر بوجھ ڈال کر گلہ گزاری کے ساتھ احسان جتا کہ اپنی اہمیت نہ بناتے تھے۔ وہ
بڑے سادہ رن طریق سے آتے اور ترنٹ اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ ہمارے گھر کے بڑے چھانک
سے ٹھنپلا کرہو شاب بھائی کا تھا۔ ہم اب بھی اسے شاب بھائی کا کمرہ کہتے ہیں۔ اس کمرے میں
کافی قلیل، دو عدد سادہ سفید پنگ، ایک چالیس سالہ پرانی سفید ڈریںگ نیبل جس پر عام طور پر خالی
پاؤڈر کا ذرہ، کسی لڑکی کا بھولا بسرا ہیئر برش اور ایک چھوٹا مبوڑا پیٹھ کا خالی گلداں دھرارہتا ہے۔
شاب بھائی اسی ڈریںگ نیبل پر اپنا چھوٹا سازپ والا بیگ رکھا کرتے۔ شروع شروع میں وہ اپنا توکیہ اور
تائش سوت ساتھ نہیں لاتے تھے۔ لیکن کچھ سفروں کے بعد شاید انہیں علم ہو گیا کہ صاف تو لئے کے
لئے بڑی ڈھونڈیا پڑتی ہے تو وہ بغیر بتائے اگلی بار سے اپنا سبز ملکڑیوں والا توکیہ ساتھ لانے لگے۔

وہ ڈریںگ نیبل پر چھوٹا بیگ چھوٹی میز پر الارم کی گھری اور سپیر پنگ پر اپنے کپڑوں والا بیگ
رکھتے۔ شاب بھائی عام طور پر سلپر ساتھ نہیں لاتے تھے۔ وہ کوئی معمولی چیز مانگ کر میزان کو بدراشراف
بڑی اپانائیت بخشتے تھے۔ ان کے سامان میں ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہوتیں۔ کنی بار سلپر بھی ساتھ
ہوتے لیکن وہ دلنشیں مکراہٹ کے ساتھ کہتے "اشفاق سلپر ہے کوئی؟"۔

یہ سن کر سارے افراد خانہ اپنے اپنے سلپر ان کے پیروں تک پہنچانا چاہتے۔ اسی ضمن میں مجھے
یاد آیا کہ ایک بار میرے بڑے بیٹے اینق خان نے اپنے سلپر انہیں دیئے۔ یہ سلپر اندر کلی سے ایک ایسی
ریڑھی کی خرید تھی جس کا دکاندار سلپر دیوں کا سائز دیکھنے کے لئے بھی انہیں ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا۔
انق خان کے سلپر بڑے نمپا ٹنک کے تھے اور نیچے سے ان میں ایسی جھریاں بنی تھیں کہ پانی ان میں کھڑا

ہو جاتا تھا۔

ایک روز شباب بھائی باورچی خانے میں آتے ہوئے بولے ”یار اشفاق یہ کیسے سلیپر ہیں؟“ -
”کیوں کیا ہوا؟“ -

”آج صبح جب میں وضو کر رہا تھا تو مجھے چوں چوں کی آواز آئی۔ میں نے سوچا کہ شاید کوئی جوہا ہے۔
میں بیدروم میں آگیا لیکن آواز ختم نہ ہوئی تو مجھے پتہ چلا کہ آواز سلیپروں سے آتی ہے۔“ -
خان صاحب کو Anecdotes بیان کرنے کا جو ملکہ ہے وہ اس درجہ خداوداد ہے کہ کوئی اور
اگر ان کا بتایا ہو اواقدہ دوبارہ ستائے تو بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہاں انہوں نے ریڈ گھنی والے کارویہ خاص
اور جوتی کے چناؤ پر اتنی خوبصورت گفتگو کی کہ ہمیں بھول گیا لینق خان شرمندہ سے کھڑے جوتی والیں
لینے کے متعلق جملے بدھے ہیں اور کہہ نہیں پاتے پتہ نہیں یہ خان صاحب کی ہار سنگار جیسی گفتگو تھی
یادوں میں چپ کا گمراہ شد تھا۔ لیکن کوئی ایسی بات ضرور تھی جس کی وجہ سے وہ دونوں ساتھ ساتھ
رہنا پسند کرتے۔ ایک روز بازار سے واپسی پر شباب بھائی بولے۔ ”بانو..... ہو سکا تو آج کے بعد میں
اشفاق کے ساتھ بازار نہیں جاؤں گا..... یہ بہت تیز چلتا ہے اور میں یقین ہو جاتا ہوں۔ یہ بہت بھاؤ تاؤ
کرتا ہے اور مجھے الجھن ہوتی ہے“ -

”ہائے کیوں شباب بھائی۔“

”آج ہم ایک لوٹا خریدنے گئے تھے..... ساری انار کلی، سارا موچی گیٹ گوم پھر آئے..... لیکن
لوٹا نہیں ملا.....“ -

”ایک معمولی ٹوٹی والا لوٹا نہیں ملا.....؟“ میں نے سوال کیا۔

”اگر میں ہوتا تو پہلی دکان سے لوٹا خریدتا اور گھر آ جاتا لیکن تمہارا شوہر تحقیق کا آدمی ہے۔ کسی
دکان پر لوٹے میں پانی بھرو اکارس کی دھار دیکھتا تھا۔ کسی دکان میں ٹوٹی کے ساتھ منہ لگا کر سانس
چھوڑتا تھا۔ کسی لوٹے کارگنگ اچھانہ لٹکا، کسی کی بناوٹ، اس لئے ہم دونوں بے پنیرے کے والیں آ
گئے خالی ہاتھ.....“ -

بادھو دیکہ لوٹے کی خریداری میں شباب بھائی کو بیدا عذاب اٹھانا پڑا؛ لیکن پھر بھی وہ خان صاحب کے
ساتھ بازار جانا پسند کرتے رہے۔ جب خان بھاؤ تاؤ کرتے اور اس کراس ناک میں دکاندار سے
سیاست، علم، آزادی نسوان سک کر رائے معلوم کر لیتے تو شباب بھائی پاس کھڑے بڑی حرمت، خوشی
اور دلچسپی سے باہمی سنتے نظر آتے۔ انہوں نے کبھی دخل در معقولات نہیں کی..... نہ ہی خان صاحب
کے اس شغل پر اعتراض کیا۔ جب بچل کار میں لرجاتے اور وہ فرشت سیٹ پر خان کے ساتھ بیٹھتے تو کبھی
کبھار کہتے ”یار جب تو دکاندار کو میز زیادہ دے آتا ہے اور اس کی منہ ماگنی قیمت ہی بالآخر دینتا ہے تو اسی

بجٹ کیوں کرتا ہے" -

خان صاحب جواب دیتے "اگر مول قول نہ کروں سودے پر تبصرہ نہ ہو تو دکاندار میرے قریب کیسے آئے؟ میں اس سے باتیں کیسے کروں؟ اس کی رائے کیسے معلوم کی جائے؟ سیاست پر اسلام پر بجٹ پر عورتوں پر آج کے اسباب زوال امت پر؟" -

جس وقت شاب بھائی کاسنی کرے میں اترتے تو اس کے بعد سب لوگ اس مجرے کے پاس سے خاموشی سے آئے جانے لگتے۔ انہوں نے کبھی کسی کو نوکا نہیں۔ شور چانے دنکافاد کرنے سے منع نہیں کیا لیکن جب وہ کاسنی خلوت خانے میں ہوتے خود بخود آوازیں دھیسی پڑ جاتیں لڑکیاں ہنٹتے ہنٹتے رک کر پوچھتیں "انکل شاب اندر ہیں؟"۔ نوجوان ایک دسرے کے کندھے پر باتحہ مار کر کہتے "چلو یا رباہر چلیں انکل شاب سورہ ہے ہیں یہ ریڑک پر کر کٹ ہو گی" " -

شاب بھائی ضرورت کی چھوٹی چیزیں مانگ کر میزان کامان بڑھاتے تھے لیکن الارم والی گھڑی انہوں نے کبھی نہیں مانگی ہر سفر پر یہ ان کے ساتھ ہوتی۔ رات کے پچھلے پر تجدید سے کچھ پسلے اس کی ہلکی سی ننگ ننگ سنائی دیتی پھر وہ یکدم بند ہو جاتی۔ اس کے بعد نہ جانے ان کے معمولات کیا ہوتے؟ لیکن سورج چڑھنے سے بست پسلے وہ سیر کے لئے ننگ جاتے۔ اس سیر کے لئے انہیں اینی خان نے ایک بڑی طرحدار چھڑی بنا کر دی تھی جو وہ ساتھ لے جاتے کیونکہ ماڈل ناؤن کے آوارہ کئے تاخہ جاری بھی تھے اور زبان دراز بھی رات ہی کو وہ پھانک کی چاہیاں اپنی الارم کی گھڑی کے پاس یا فیوز باکس میں لٹکا لیتے ان کی کسی احتیاط میں اصرار نہ تھا۔ نہ عقی وہ چاہیوں کے لئے کبھی شور چاہتے "اوہ بھی چاہیاں کہاں ہیں؟"۔ رات کو کہاں رکھتے ہو چاہیاں مجھے دے کر کیوں نہیں سوتے؟" وہ چوری چوری رات ہی کو چاہیوں کا اہتمام کر لیتے۔ صح و بے پاؤں اٹھتے، برآمدے میں سے گزرتے، کالے پھانک کاتالا کھولتے اور سیر کو ننگ جاتے۔

شاب بھائی انجانتا کے مریض تھے انہیں برسوں سے شوگر آتی تھی ان کی ایک بانگ کے سارے اعصاب خراب تھے وہ ہر سال معاونت کے لئے لندن جاتے اور جو کچھ ڈاکٹر کہتا میں و عن اس پر عمل کرتے۔ شاب بھائی نہ تو اس لئے علاج کر داتے تھے کہ انہیں اس اپائے پر اعتماد تھا۔ نہ ہی اس لئے لندن عازم ہوتے کہ وہاں کادو اداروں میں تھے۔ بس وہ ماننے والوں میں سے تھے اور علاج کے معاملے میں جو حصہ مقرر ہو گئی تھیں ان سے تجدوں نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر ان کے بڑوں نے بیماری میں کوئی چارہ کروا یا تو وہ بھی علاج معالجہ کے لئے حاضر تھے پسلے پسل جس ڈاکٹر سے لندن میں بن بس کے دونوں مطاقات ہو گئی اسی کا بندو بست جاری رکھا۔ وہ ڈاکٹروں پر اعتماد کئے بغیر ان کا حکم مانتے رہے ایک حکم اس میں سیر کا بھی تھا۔

شہاب بھائی کو سیر پسند نہ تھی۔ جس روز مگرچ چک کے ساتھ مبینہ بُرستایا مئی کے مینے کی گلی آندر ہیں چلتیں، وہ صبح بہت خوش ہوتے اور اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے کہتے ”آج تو سیر سے چھٹی ہو گئی.....“

یہ نہیں کہ وہ ان مانے جی سے سیر کرتے تھے۔ ان مانے جی سے انہوں نے کبھی کچھ نہیں کیا۔ ناپسندیدہ عمل بھی بوقت ضرورت بڑی خود دلی سے نپالیتے تھے..... ان کے پاس نیلے رنگ کی ایک گولی ڈیا تھی۔ سیر سے واپسی پر وہ اپنے کمرے میں جاتے اس ڈینا میں سرخ نارنجی سفید، براؤن کنی قسم کی گولیاں ڈالتے، ڈیا کو احتیاط سے اٹھاتے اور باور پی خانے میں آ جاتے۔ ان گولیوں کو دیکھ کر ہمیں تعجب ہوتا..... کتنی بار تو وہ ہماری حیرت کو نظر انداز کر دیتے لیکن کبھی کہتے۔ ”یہ کتنی قسم کی گولیاں ہیں۔ کچھ انجامنا کے لئے..... کچھ اس نانگ کے لئے جس کی حیات ختم ہو چکی ہیں اور کچھ شوگر کے لئے.....“

”کیا آپ کو ان دوائیوں پر اعتماد ہے شہاب بھائی؟“ - میں پوچھتی۔

”ڈاکٹر ہم سے بہتر جانتا ہے کم از کم علاج کے ضمن میں..... ہمیں اعتبار کرنا چاہئے۔ اور پھر اگر انہوں نے بیماری میں توڑ کیا تو ہمیں حد کر اس نہیں کرنی چاہئے۔“ - میں نے شہاب بھائی کو کبھی رسول اللہ کا نام لیتے نہیں سن۔ وہ اس ذات سے بہت جھینکتے تھے اور ان کا ذکر سنتے ہوئے بھی ان پر شرم ساری طاری ہو جاتی تھی۔ اگر کبھی اتفاقاً تذکرہ آبھی جاتا تو ان کے ماتھے پر عرق انفعاً ضرور چلکتا۔ لگاتا جیسے کوئی پروڈ فاش ہو گیا ہو۔

چهل قدمی سے واپسی پر ان کے ساتھ عام طور پر چھوٹا سا کوئی واقعہ بھی ہمراہ ہوتا جو انہیں مطالعہ قدرت کے دوران پیش آیا ہوتا۔ کوئی ٹھیوں کے نام، دھوپی گھاث، راہ میں ملنے والے دوسرے سیر کے شوقین، دودھ لے جانے والے گجر، اخبار تقیم کرنے والے نوجوان، کسی کسی گھر میں صبح کے وقت نیکسی یا کار سے اترنے والی سواریاں، راستوں پر کوئی کھلانا کا اور تقریباً ہمیں بند گیٹ..... لشکر کی باڑھوں سے پھر سے اڑ جانے والے پرندے، دیر تک جلتے رہنے والے سڑک کے قفقے..... وہ اس ہواخوری سے کچھ نہ کچھ چن کر ہمارے لئے ضرور لاتے تھے۔ ان کا مشاہدہ اتنا تیز تھا کہ ہر نی دیکھ کے ساتھ پرانا تجربہ ملا کر ایسی ایسی خوش رنگ اور مزاح آمیز گفتگو کرتے کہ صبح دل تمام کدو روں سے پاک ہو جاتا۔ بات شروع کرتے ”اشفاق..... اگر تمہارے گھر سے دائیں طرف مزکر چلانا شروع کر دو تو پسلے کر اس نگ کے پاس نرسی آتی ہے اس سڑک پر کوئی سو قدم کے بعد ایک ہونڈ ہو گئی۔ آج اس کے سامنے میں نے ایک دودھ والے کو کمیٹی کے نلکے سے دودھ میں پانی ملاتے دیکھا۔ دودھ میں پانی ملانے کے بعد آمیزش والا دودھ ہم تھیلی میں ڈالا اور بڑے لطف سے اسے چکھا۔“

شہاب بھائی کے چہرے پر ہمکی سی شرارت من موہنی مسکرا ہٹ اور اویب کی گمرا جانچ پڑتاں آ جاتی ہے، ایک معنوی واقع کو بڑی خوبصورت تفصیل، جاندار تجویزی اور تازگی سے بیان کرتے۔ سیر کے ساتھ وہ یہ پھول ہمارے لئے چن کر لاتے اور ان کا ہر کیف نظارہ ہمارے لئے ایک واقعہ بن جاتا۔ شروع شروع میں شہاب بھائی کی اس مارنگ ٹاک کی میں عاوی نہ تھی۔ کیونکہ اس میں خان صاحب جیسی چک اور ہیورنہ تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہی صحیح کی چائے کا وقت ایسا ہو گیا جب خان صاحب اور میں شہاب بھائی کو مکمل طور پر شیزٹ کرتے، ان کی سنتے اور ان کی برکت کے ساتھان تلے اڑام سے بیٹھنے اور زندگی گزارنے میں سولت محسوس کرتے۔

شہاب بھائی کی باتوں میں ہو سولت اور لذت محسوس ہونے لگی یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ کچھ وقت یہے بھی ان کے ساتھ آتے تھے جب میں مارے عزت کے کمرہ چھوڑ جاتی تھی لیکن اندر کڑھتی رہتی تھی۔ یہ وقت وہ تھا جب خان شہاب بھائی کے پاؤں ہاتھ میں لے کر نیچے بیٹھتے اور عینک لگا کر ان کے ناخنوں کو دیکھنے لگتے۔ وجہ یہ تھی کہ شہاب بھائی کے ان گھوٹوں میں جو ناخن اگتے ایسے ناخوار ہوتے کہ یہدھلابر نکلنے کے بجائے اندر کی رفت مزکر گوشت میں پیوست ہونے لگتے۔ یہ ناخن خان صاحب بڑی پرست سے، جیسے کوئی لڑکی گزیا کو کپڑے پہناتی ہے، کانا کرتے تھے، وہ بار بار پلائیر نمائیں کڑکو جانچتے شہاب بھائی کا چھرو دیکھتے اور پھر اپنے قول کرنا خن کاٹنے لگتے۔ شہاب بھائی بڑے تشكیر سے کہتے۔ ”یار شفاق جب سے تم میرے پیدی کیور سٹ بننے ہو مجھے بڑا آرام ہو گیا ہے ورنہ کئی بار تو مجھے اس وقت تک منتظر کرنا پڑتا تھا جب تک لندن جانے کی صورت نہ پیدا ہو۔“ شہاب بھائی ناخن کٹوائے رہتے خان ناخن کاٹنے رہتے اور میں کمرے سے باہر سوچتی کیا یہ عمل ضروری ہے؟۔ جب شہاب بھائی سکھی سے ہو را پہنچانے کا سنی کمرے میں چلے جاتے تو میں خان صاحب سے کہتی..... ”میں نے سنا ہے باتا کے اوپر ایک قابل پیدی کیور سٹ بیٹھتا ہے آپ شہاب بھائی کو دہاں کیوں نہیں لے جاتے؟۔ جب آپ یوں سر جھکا لر ان کے پیروں میں بیٹھتے ہیں تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔“ خان لائقی سے کہتے ”تمہیں علوم نہیں شہاب کی جلد بہت زم اور ناخن بہت سخت ہیں قدسیہ نہیں مجھ سے بہتر اور احتیاط کے ساتھ لوئی نہیں کاٹ سکتا۔“ ایک بار جب ناخن کٹ گئے اور شہاب بھائی نے سکھ کا سانس لیا تو قدر نے وقف کے بعد وہ بولے ”اشفاق یار زندگی کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کیا پتہ تیری میری لڑائی ہو جائے اور ہماری بول چال ہی بند ہو جائے لیکن یار میری ریکوست ہے کہ میرے ناخن کاٹنے نہ چھوڑنا۔ تب خان کے اس عمل کے ساتھ میں متفق نہیں تھی اس لئے میں نے اس کمرے میں رہنا چھوڑ دیا۔ پھر وقت گزرنے پر، کچھ اور جتیں کھلنے پر، پردے اٹھنے کے بعد، تھوڑی سی راہ ملنے پر میرا ویہ بالکل بدل گیا۔ اب خان صاحب اسلام آباد جانے لگتے تو میں پوچھتی ”خان..... وہ ناخن کاٹنے والی کٹ ساتھ رکھ دیں؟“

شہاب بھائی لاہور آتے تو میں کہتی "خان جی..... شہاب بھائی نے پوچھ لیں تا خن بھگتہ کرتے ہوں"- جب خان صاحب تا خن کاٹ رہے ہوتے تو میں بولتی رہتی "یہ کمزیاں کل بے کار ہے اتنا زور لگتا ہے خان صاحب آپ پلیز جاوید طارق سے کہیں وہ باہر آتا جاتا رہتا ہے ایک کٹ تو لے آئے مناسب قسم کی"-

یہ فقیر لوگ بڑے ڈالہٹے ہوتے ہیں آپ کے دشمن سے چھپتی ڈلا کر رہتے ہیں۔ جمال آپ شادی نہیں کرنا چاہتے وہیں کروادیتے ہیں۔ جس یوں کو آپ چھوڑنا چاہتے ہیں اسے ہی پٹرانی ہے دیتے ہیں۔ ساگ پات، بینگے، کھیر، چنی، روٹی آپ کی خواراں بن جاتی ہے۔ لوگوں کا پاشویہ کر کے آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کا ہی احسان ہے کہ پاہن دھونے کو دیئے۔ آپ کو پتہ نہیں چلتا اور آدمی رات کو آپ کی آنکھ کھلنے لگتی ہے۔ خیرات لینے والوں کا شکریہ ادا کر کے راحت ملتی ہے۔ لوگوں کا گلہ سن کر چپ رہنے کی عادت ڈال دیتے ہیں۔ یہ ڈالہٹے لوگ اونکے لوگوں کے ساتھ اور بھی ڈالہٹے ہوتے ہیں۔ خان صاحب بابا نور والے کے ڈیرے پر جایا کرتے تھے۔ ایک بار شہاب بھائی نے مجھے بنس کر کہا..... "بانو اشراق ڈیرے پر بڑی باقاعدگی سے جاتا ہے۔ یہ ڈالہٹے لوگ ہوتے ہیں یہ فقیر ببابا جی چیسے..... روٹی بوٹی کھلاتے ہیں اور انسان اپنے داؤنوں سے اپنی قریبار کر لیتا ہے۔ یہ گھیث ببابا جی چیسے..... تو تمہبو کر کے بیار دیار سے ادھر کے رستے پر ڈال دیتے ہیں پھر پروانیں کرتے کہ آپ پر کیا بیت جاتی ہے۔ ان کا بس اتنا ہی کام ہے۔ کھوئی ہوئی بھیڑیں جمع کرنا..... راستے پر ڈالنا اور بس پھر بھیڑ جانے اور بھیڑوں والا جانے یہ پروانیں کرتے۔

شہاب بھائی کے جانے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت سکھی کہ وہ بھی بڑے ڈالہٹے تھے انہوں نے بھی خان صاحب کے ساتھ اچھی کی..... پرست سے تا خن کٹوائے۔ بن بولے شکر سے موں کیا..... بھیڑ کو جنگلوں کے راستے پر ڈالا اور اپنے کندھے پر بھورا ڈال رخصت ہو گئے۔ میں ان دونوں کے اندر ورنی رابطے کو نہیں سمجھ سکی۔ شاید کچھ تھا..... شاید نہ تھا۔ میں بیساں اشراق احمد کا ایک مضمون جوانہوں نے پشاور میں پڑھا من و عن لکھتی ہوں تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ خان کا رشتہ شہاب بھائی کے ساتھ کیا تھا؟۔ اس میں کتنی دوستی، کیسی رفاقت اور کس قدر عاجز تھا خود پر دگی تھی؟۔

”چندن کا پیر“

میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ بات کہہ دینی چاہئے اور اس کے کئے میں کسی حسم کی مددت کو یا کسی حیلے کو سارا نہیں بناتا چاہئے اور کسی عذر خواہی کے بغیر اس کا اعلان کر دینا چاہئے کہ میں قدرت اللہ شاہب صاحب کا خلیفہ ہوں اور واحد خلیفہ ہوں کیونکہ انہوں نے خود اپنی زبان سے دو مرتبہ واعظاً الفاظ میں بیان دیا تھا کہ ”اشفاق احمد میرا خلیفہ ہے۔ میں اس کو اپنے خلیفے کے طور پر قبول کرتا ہوں“ اور اس کے لئے دعا کرتا ہوں ”پھر انہوں نے میری یوں سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ میں اشفاق کے لئے اور اس کے گمراہنے کے لئے اور اس کے پھول کے لئے دعا کرتا رہوں گا اور خداوند کریم سے چاہوں گا کہ وہ میری دعائیں قبول فرمائے اور اس کے گمراہنے کو خیر کیش عطا فرمائے۔

جب دعا ہو چکی تو میری یوں نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا ”اب اس بات کو چھپا کر رکھنا اور کسی کے سامنے اس کا اظہار نہ کرنا اور نہ ہی وہ عمل کرنا جس سے کسی کوشک پڑے کہ تم ان کے خلیفہ ہو اور تم کو انہوں نے اپنی خلافت کے لئے جنم لیا ہے۔“

در اصل میری یوں کو اور ممتاز مفتی کو شروع ہی سے قدرت اللہ شاہب کے نام سے چشمی اور مجھے ان دونوں کی آنکھ بچا کر شاہب سے ایسی پوشیدہ جگنوں پر ملنا پڑتا تھا جہاں کسی کو گمان بھی نہ گزرنے کہ ایسی غیر مہذب اور غیر معزز جگنوں پر لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بھی سپہریں اور چھوٹی چھوٹی مغربیں گزرنے سکتے ہیں۔ در اصل ہم کو ایک دوسرے کے ساتھ بھی بھی بلکہ بست ہی بی باتیں کرنے کا برا شوق تھا جن میں عام طور پر چھوٹی بڑی کینٹیوں کے تنفصی مذکرے ہوتے تھے اور ان میں بست سے جانے پہچانے نام کپڑے دھونے والی مشین میں جپچیاں ڈالتے اور دھکے دیتے کپڑوں کی طرح گھومتے رہتے تھے۔ کئی سال بعد ابن انشاء بھی ہمارے ساتھ آٹا اور ہمارا عملہ ادارت اور بھی فعال ہو گیا۔ باونقدیہ کو ہماری نگت کا ابن انشاء بھت پسند آیا لیکن قدرت اللہ شاہب سے وہ بدستور کشیدہ رہی۔

متاز مفتی کو اور میری بیوی کو اونچے درجے کے سرکاری افسروں ہے ایک عجیب طرح کی کہ تھی۔ متاز مفتی ہر بڑے افسر اور نائی گر ای بیوہ کریٹ سے اس وقت تک نہ کھلتا تھا جب تک کہ ٹھبی مار کر اس کو نیچے نہ گرایتا اور اس کی چھاتی پر اپنا دائیں پیر کھ کر یہ صدابند نہ کر لیتا کہ ”بھتی ہمارے لئے کیس سے دو کریاں بھجواؤ۔ بڑے صاحب تشریف لائے ہیں۔ ان کے لئے کوئی چائے پانی کا بندو بست کرو“۔ اور بانو قدیسہ کو صرف یہ خوف رہتا تھا کہ لوگ دیکھیں گے تو افسر بازی کا لطعنہ دیں گے اور کیس گے کہ ان لوگوں نے اپنی زندگی اپنی محنت سے خود نہیں بنائی بلکہ افسروں کے رسخ کی وجہ سے سفارشی سارے پر بنائی ہے۔ ان دونوں میاں بیوی کے اپنے ہاتھ پلے کچھ نہیں افسروں کے کاسہ لیں ہیں اور مشکل یہ تھی کہ شباب نہ صرف ایک افسر تھا بلکہ بہت بڑا افسر تھا۔ کسی حد تک سب سے بڑا تھا کیونکہ اس کے فوراً بعد صدر مملکت آ جاتا تھا اور پھر مملکت خدا وادی کی حدیں ختم ہو جاتی تھیں..... بانو قدیسہ کا تقاضا یہ تھا کہ پہلے شباب صاحب کو رہا رہ ہو لینے وہ ان کو ایک بے مقنی بے کار بے وسیلہ اور بے حال شخص بن لینے دو پھر میں ان کی طرف رجوع کروں گی اور متاز کی مشکل یہ تھی کہ وہ کئی ٹھبیاں چلا چکا تھا اپنے ساتوں واو استعمال کر چکا تھا لیکن شباب ڈھیٹا نہیں تھا۔ ڈھیٹا اس لئے نہیں تھا کہ اس نے کبھی خم بھی نہ ٹھوٹا تھا۔ اکھاڑے میں ہی نہ اڑتا تھا۔ بڑھک، ہی نہ ماری تھی۔ دعویٰ ہی نہیں کیا تھا۔ مفتی پریشان تھا اور بانو محبوب تھی اور میں خوش تھا کہ اپنے ان دو پیاروں کو ایک طرف کر کے مجھے شباب سے ملنے کا وافر وقت مل رہا ہے اور گھونٹے پھرنے کی مکمل آزادی ہے۔

اصل میں آج تک میرے سارے کام انہوں نے ہی کئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لطف بے پایاں اور خیر کیش کے مجھے تک مجھنے کا سامان ہمیشہ بندوں نے ہی کیا ہے۔ بیماری میں میرا علاج ہمیشہ کسی انسان نے کیا۔ باعزت طور پر بری انسان نے کیا..... نعمتیں ہمیشہ بندے ہی اٹھا کر، دھو کر، کاٹ کر، سجا کر لائے۔ جب اللہ نے مجھے خوش کرنا چاہا تو لوگوں سے ہی تالی بھوائی۔ جب مجھے محبت عطا کرنی چاہی تو کسی شخص سے ہی مجھے جیچھی ڈلوائی۔ جب میں نے سفر کا رادہ کیا تو ایک بندے کو ہی میرا پائلٹ بنایا۔ مجھے چیزوں کی ضرورت پڑی تو پے کلر ک نے ہی مجھے پیسے لا کر دیئے۔ میں جوں مجھے ہمیشہ ایسے ہو شنس نے پایا اور میاں محمد صاحب کے شعر مجھے بندے نے ہی سنائے۔ اس کافضل اور اس کا کرم مجھ پر ہمیشہ کسی انسان کی معرفت ہی پچھا۔

لیکن شباب تو ان سب بندوں سے ان سب آدمیوں سے بہت ہی مختلف تھا۔ وہ انعام

بُر اور فضل بردار نہیں تھا۔ خود انعام اور خود فضل تھا۔ یہ بات میں کسی رو حاصل سلسلے یا تصوف کے حوالے سے نہیں کہہ رہا۔ خالص دنیاداری کے رخ سے کہہ رہا ہوں کہ شہاب کے قریب رہنا خیر کے ساتھ رہنا تھا اور اس کے ساتھ مسلک ہونا ہر طرح کی یافت سے وابستہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اخباروں میں چھپتا ہے یا لوگوں کی زبانی پتہ چلتا ہے کہ شہاب کے یاروں نے اس کی ذات سے کس قدر فاائدہ اٹھایا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ واقعی جو بھی اس کا یار تھا خوش قسم تھا بتوہنگی اس کے قریب تھا مالا مال تھا۔ ہم نے اس سے جی بھر کے فائدہ اٹھایا۔ اتنا فائدہ کہ کوئی انسان کسی انسان سے اٹھا ہی نہیں سکتا۔ مال و مال، فارغ البال، پرباش، ہم تو بت قریب کے لوگ ہیں جو شخص اس کے پاس سے بھی گذر گیا اس کے خیال سے بھی گذر اس کی زندگی بھی سچھل ہو گئی۔

مجھے یہ تو یاد نہیں کہ کب اور کس وقت اور کس مقام پر متاز مفتی اور باؤقدیسے نے نیا حجم لیا البتہ سرو بیوں کی وہ صبح اچھی طرح سے یاد ہے جب بانو نے بڑی لجاجت سے کہا "میری ایک بات نہیں گے"۔ تو میں کچھ خوفزدہ سا ہو گیا تھا۔ اس نے کہا "آپ شہاب بھائی کو "تو" اور "تم" کہ کرنہ پا کر اکریں اور اگر کہنا ہو تو کم از کم میرے سامنے نہ کہا کریں"۔

پھر متاز مفتی نے اپنے سیٹلڈیٹ ناؤن والے پہلے گھر میں گرج کر کہا "اوے تم انہی ہو؟ بھرے ہو؟ تم سارے وجود کے سارے رستے میں بند ہو چکے ہیں کیا..... اوے تم کو نظر نہیں آتا کہ وہ کون ہے۔ گزرے ہوئے وجود کیا تم سارے ذات کے سارے ہی انتہی اور ایریل شارٹ سرکٹ ہو گئے ہیں..... تم انسان ہو کہ کیا ہو ائے"۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ مفتی کے کہنے کے باوصف اور اپنا سارا ازور لگانے کے باوجود مجھے تو کچھ بھی نظر نہ آیا۔ میں کچھ نیسا ذافر بھی نہیں ہوں۔ کچھ ایسا برا، گند اور ناپاک بھی نہیں۔ کوئی خالص کم علمی بھی نہیں پھر میں سوچنے، جانے اور محسوس کرنے کی آرزو بھی رکھتا ہوں لیکن میرے سارے خانے خالی ہیں کم از کم وہ سارے خانے ضرور خالی ہیں جو مفتی جیسے لوگوں کے بھرے ہوئے ہیں۔

بانو اپنے تینوں بیٹوں کو لے چو فے پر بٹھا کر اور خود نیچے قائم پر بیٹھ کر کہا کرتی "ویکھو بیٹا! ہم بڑوں جیسے تو نہیں بن سکتے۔ کیونکہ یہ ہمارے لئے طے نہیں ہوا ہے۔ یہ ہماری برات نہیں ہے..... لیکن بیمارے بیٹو ہم ان کے قریب ان کے ساتھ ساتھ ان کے نزدیک تو ضرور رہ سکتے ہیں۔ ان کی حد ناگاہ میں تو ضرور آسکتے ہیں۔ ان کے کارندے تو بن سکتے ہیں۔ اس لئے میرے بیمارے بچو جب شہاب بھائی آئیں تو ان کے قریب قریب رہا کرو۔ گھر سے باہر نہ جایا کرو..... جایا کرو تو جلد لوت آیا کرو۔ بہت قریب نہ ہو سکو تو ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کی

کوشش تو کیا کرو۔ شہاب بھائی چنن رکھی ہیں۔ صندل کا پڑیاں ہیں۔ ان کی چھاہیں بھی ہے اور خوبیوں۔ یہ دو ایسی ہیں اور شفا بھی ہے۔ اس کے ارد گرد رہا کرو۔ ان کی قربت سے فائدہ اٹھایا کرو۔ سنہارے بچو! انہا جو صندل کے وجود سے مس کرتے رہو۔

لکھ لکھ بدیاں سوسو طعنے سبھر سرتے سئے دو

تال بجن دے ریئے دو

خن جنسناں دا ہو دے دار و حال اتحائیں کئے دو

چن رکھ لگوچ دیر ہے زور د گھانے کھیتے دو

رہئے دو

کے حسین فقیر سائیں دا جیوندیاں مر رہئے دو

تال بجن دے رہئے دو

اس کے تئے کو چھپا ڈال کر کھڑے رہو۔ کچھ نہیں کہنا۔ کچھ نہیں
مالکنا۔ بس چن رکھ کے ساتھ اور اس کے قریب رہنا ہے۔ اس کے ساتھ لگ کر زندگی بر کرنی ہے۔ خوبیوں خود بخود تمہاری ذات کا حصہ بن جائیں گی۔

بچے پوچھتے ”ای ٹھیک کتنی ہیں ابو؟“۔

میں کہتا ”بھائی مجھے کیا معلوم۔ تم جانو اور تمہاری ماں جانے۔ لیکن اگر جسمیں اسی قدر بیک ہے تو پھر تم شہاب پچا کے آنے پر اتنا زیادہ گھر پر کیوں رہتے ہو۔ کیا تمہارے دوست دوستیاں نہیں ہیں؟ کیا جسمیں پہلے کی طرح کام نہیں ہوتے۔ کیا تمہاری آشنا ہیوں کی ساری روشنیاں گل ہو جاتی ہیں؟“۔ لیکن میرے خیال میں بچے باپوں کے مقابلے میں ماں سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ جب ان کی ماں شہاب پچا کے آجائے پران کے معصوم کالوں میں لوٹ سل!!“ستے سو دے”“اچے سو دے” پھوکتی رہے اور بار بار اور

Profiteer Profiteer Capitalize Exploit

کہتی رہے تو اس کا بچوں کے دماغ پر اڑھ ہوتا ہی ہوا..... میرے گھر میں سارے بچوں پر اور ان کے دوستوں پر اور ان کے دوستوں کے دوستوں پر بچھے ایسا جادو گاہو اتھا کہ شہاب صاحب کے آجائے پر وہ سارے ان کے گرد پر و انوں کی طرح جمع ہو جاتے اور اپنی اپنی مشکلات علیحدگی میں یا سب کے سامنے ”اکل شہاب“ کو تاکر ان سے رائے لیتے رہتے۔ یونگ جنزنیشن میں شہاب صاحب سے زیادہ پاپولر ”ببا“ میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔ مجھے پتہ تھا کہ چونکہ وہ نوجوانوں کی ہریات خندہ پیشانی سے سن لیتے ہیں اور کسی کو کسی بات پر سرزنش نہیں کرتے، جھٹکی نہیں

دیتے اس لئے پاپولر ہیں۔ لیکن جلد ہی نوجوانوں کے اس گروہ کے بعد ملازموں کے پھر مغلداروں کے اور بزرگوں کے اور خواتین کے اور شیم دانشوروں کے اور جنبداریوں کے گروہ آنے شروع ہو گئے اور شاب صاحب سے پتہ نہیں ان کو کون سی گیدڑی سنگی ملنے لگی کہ اس جم غیر میں اضافہ ہی ہوا گیا۔ مجھے سب سے بڑی شرم اس بات پر آتی تھی کہ اگر میرے ہم عصر اوپر، شاعروں اور صحافیوں کو اس بات کا علم ہو گیا کہ اشراق صاحب کے گھر پر کیا ہو رہا ہے تو وہ میرا باقی مانند بھی اپنی برادری سے نکال دیں گے۔ میں پسلے ہی وقید نوس، رجعت پند، جمل و دست اور گنوار نواز مشهور تھا۔ میرا کیا بنے گا!

میں نے ایک سوچی سمجھی سیکھ کے تحت ان بے یار و دگار ضرورت مندوں اور بے نواو بے آسر احاجت مندوں کا داخلہ اپنے گھر بین کر دیا اور انہیں اچھی طرح سمجھادیا کہ تم کو جو کچھ لینا ہے خدا سے لو۔ جو کچھ مانگنا ہے خدا سے مانگو۔ ایک فانی انسان سے رائے لیتے ہوئے اور اس کی باتوں پر عمل کرتے ہوئے اور ایک شخص کو اپنے سے برتر سمجھتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ جیسے انسان تم ہو ویسے ہی انسان وہ ہیں۔ جس خدا کی تم مخلوق ہو اسی خدا کی وہ مخلوق ہیں۔ جو صلاحیتیں خدا نے تم کو دی ہیں وہی ان کے پاس ہیں پھر تم اپنے مسائل لے کر ان کے پاس کیوں آتے ہو اور اپنی مشکلوں کو ان سے کیوں بیان کرتے ہو!۔ میرے گھر سے بھیز تو چھٹ گئی لیکن میرا گھرانہ جس شبکی پھوار میں برسوں سے لپٹا ہوا تھا اس پر گرم لمحوں کی پیش قد میاں شروع ہو گئیں اور ہم اپنی کمزور چھتوں کے نیچے کڑی دھوپ کے کوڑے روڑے ہو کر رہ گئے۔

متاز مفتی نے زندگی کے ہر نئے تدریپوں تو ہر شخص اور ہر شخصی اور ہر صورت اور ہر مورت سے پیار کیا ہے اور بعض اوقات اتنا زیادہ کیا ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ ہماری جان بھی بیویشہ ٹکنے میں جذبی گئی ہے۔ ایک توکلوخ اندازوں کی ہر وقت کی سُنگ باری کہ متاز مفتی یہ کیا کر رہا ہے دوسرے متاز مفتی کاظمالمانہ رویہ کہ ہم بھی اس کے محظوظ سے اتنی ہی محبت کریں جتنی وہ خود کرتا ہے۔ اس کے بھی اتنے ہی نظرے اٹھائیں جتنے وہ خود اخھاتا ہے۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے پر ہم بھی کم از کم تین مرتبہ بسم اللہ کہیں..... ہم متاز سے ڈر کریے سب کچھ کرتے تو رہے لیکن اس کی آئئے دن کی محبوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ لیکن جو عشق متاز مفتی کو شاب کی ذات سے ہوا اور بھری دنیا میں سب کے سامنے ہوا اور جو خود شاب کے منہ ورمنہ ہوا اس کی مثل شاب کے چاہنے والوں میں سے کسی کے پاس بھی نہیں، نہ گھر والوں کے پاس نہ باہر والوں کے۔ ہم نے کتابوں میں ایسے قصے ضرور پڑھے تھے لیکن اپنی آنکھوں سے ایسا ہوتے

تھیں دیکھا تھا۔ اس محبت کے سلسلے میں متاز مفتی نے ہم سے کوئی تقاضا نہیں کیا۔ اپنے تعلقات سے ہماری ملکیتیں کس کر ہم کو زد و کوب نہیں کیا۔ ہمارے اور کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ صرف ہم ناپینا تو اس کی کوئی جگہ پر افسوس کیا کرتا تھا۔ ہم اس کے ہادی، اس کے مرشد کا ادب کرتے تھے لیکن اس کو وہ نہیں سمجھتے تھے جو اس کے ذہن نے اور اس کی روح نے سمجھ رکھا تھا۔ ایسا کیوں ہوا اور اس کی سمجھ بوجھ اور ذہانت ہمارے دیکھتے دیکھتے کیوں پلٹ گئی۔ یہ محبت کا کوئی گمراہ از ہے جو میری گرفت میں نہیں آتا۔ یہ راز شاید انہی لوگوں کی آنکھوں میں آتا ہے جو محبت والے لوگ ہوتے ہیں۔ جن کی رو میں محبت میں گندھی ہوتی ہیں اور جو محبت کرنے کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں۔ متاز مفتی بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہے لیکن اس کی تباہ کن اور خود ٹھکن خرابی ایک ہی ہے کہ وہ بہت اونچی آواز میں محبت کرتا ہے۔ اتنی اونچی آواز میں کہ محبوب خوفزدہ ہو کر بھاگ جاتا ہے اور ہمسائے جا کر پرچہ کٹا دیتے ہیں کہ ہمارے پڑوس میں اونچی آواز میں محبت لگائی جا رہی ہے۔

یحییٰ خان کے دور میں جتنے سال شاہب، عفت اور ہاقب ولایت رہے مفتی بظاہر پر سکون اور باوقار اور پرباش رہا لیکن بیاطن ماہی بے آب تھا۔ ان دونوں وہ نیش ضبط کے مزے لے رہا تھا اور اس کے پاس سوانع ضبط کے اور کوئی متعانہ تھی۔ وہ ہر وقت اسی بات کے انتظار میں رہتا تھا کہ ایک نہ ایک روز دکھ دلدر کے یہ اندر ہیرے خود بخود دور ہو جائیں گے۔ سورج مغرب سے طلوع ہو گا اور ہمارے تاریک صحن خانہ میں ہیئتگانی کی دھوپ آجائے گی۔ ”بی جمن جی دیکھتے جاؤ“ مفتی کرتا۔ وہ آجائے گا تو سب کام سدھ ہو جائیں گے۔ سارے رستے روشن ہو جائیں گے۔ سب ایسے ٹھیک ہو جائے گا جیسے کارروں کے سفر میں پڑا اور پر خیسے لگ کر شہر سا آباد ہو جاتا ہے..... تم سمجھتے کیوں نہیں ہو اور محبوس کیوں نہیں کرتے ہو۔ تمہاری نظر اتنی کوتاہ اور تمہارے اندر یہ اتنے دراز کیوں ہیں۔

یحییٰ خان کے زوال کے بعد شاہب صاحب جب لندن سے واپس پاکستان آئے تو گوان کو بستی بیماریوں نے گھیر کھاتا لیکن ان کی صحت جسمانی کافی اچھی تھی۔ عفت البتہ کمزور کمزور اور بیماریاری تھی۔ ہم عفت کو پہلے بھی اچھی طرح سے جانتے تھے لیکن اس کی بیماری نے اور پھر لاہور میں بانو کی گنجیداشت نے اسے اور بھی ہمارے قریب کر دیا۔ شاہب ہر ہفتے اپنی بیوی کی خبر پوچھنے باقاعدگی کے ساتھ اسلام آباد سے لاہور آتے رہے اور بانو قدسیہ لاچی ملی کی طرح اپنے بچے انھا اٹھا کر شاہب بھائی کے ارد گرد بٹھاتی رہی کہ شاید اسی طرح وہ رو بھائی سے شیری کی طرف مائل ہونے لگیں۔ کبھی کبھی مجھ سے بھی کہہ دیا کرتی کہ آپ بھی بچوں کے